یکم ستمبر ۱۹۷۰ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۲۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۱۷

اس شمارے میں

آل احمد سرور

میں نے امریکہ کو کیسا پایا؟

(۱۰)

امریکہ میں ادبی فضا کے متعلق خاصی غلط فہمیاں ہیں۔ ہر ملک کی طرح یہاں بھی ادبی کام کئی سطحوں پر ہوتے ہیں۔ جو لوگ سب سے مقبول کتابوں (BEST SELLERS) سے امریکہ کی ادبی فضا کا اندازہ لگاتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ مقبولیت کسی طرح لازمی طور پر ادبیت کی دلیل نہیں ہے، ہاں کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ادبی کارنامہ مقبول بھی ہوتا ہے۔ مثلاً امریکہ کے اچھے شاعروں میں رابرٹ لاویل اس وقت سب سے ممتاز سمجھا جاتا ہے۔ اس کا تازہ ترین مجموعہ ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا مگر اسے کسی طرح مقبول ترین نہیں کہا جا سکتا۔ گنس برگ (GINS BERG) جو اپنی مشہور نظم چیخ (HOWL) کی وجہ سے مشہور ہوا، آج بھی مقبول ہے اور اچھی نظمیں لکھ رہا ہے مگر اسے بھی مقبول ترین نہیں کہا جا سکتا۔ اس طرح رابرٹ بلائی (ROBERT BLY) اور ڈینس لیورٹوف (DENISE LEVERTOR) اور رابرٹ کیلی خاصے ممتاز ہیں اور مقبول بھی لیکن کسی طرح ان کی کتابیں (BEST SELLER) نہیں ہیں۔ ناول شاعری سے زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ اس وقت امریکہ میں ممتاز ناول نگار سال بیلو، فلپ راتھ، جان اپ ڈائیک، میری میکارتھی، مالمود ہیں۔ ان پانچ میں سے تین یہودی ہیں۔ سال بیلو کے مقابلے میں جو یقیناً ان ناول نگاروں کے مقابلے میں بہتر فنکار ہے اور زیادہ گہرائی میں جاتا ہے، فلپ راتھ اس وجہ سے بہت مقبول ہوا کہ اس نے اپنی ناول "پورٹ نوائے کا شکوہ" میں ہیرو کی مشت زنی کا تذکرہ خاصی تفصیل سے کیا تھا، مگر دراصل ناول یہودیوں کی نفسیات کے بارے میں ہے۔ نقادوں نے اسے یہودیوں کے ماحول پر خصوصاً یہودی ماں پر ایک دلکش اور قابل قدر طنز قرار دیا۔ جان اپ ڈائیک کی ناول جوڑے (THE COUPLES) میں نے ہندوستان میں پڑھی تھی، اس کے متعلق مجھے حیرت یہ تھی کہ یہ اتنا مقبول کیوں ہوا۔ اس نے شکاگو میں رچرڈ ورشرن سے جو انگریزی کے پروفیسر اور خود ایک ممتاز ناول نگار ہیں، میں نے اس کی مقبولیت کی وجہ دریافت کی۔ ناول میں دراصل امریکہ کے ایک خوشحال طبقے میں بیویوں کے تبادلے کا مسئلہ ایک خاص انداز سے لیا گیا ہے اور اس کے اوپر ایک لطیف انداز میں طنز کی گئی ہے، مگر اس میں عریانی میرے نزدیک ادبی دائرے سے تجاوز کر گئی ہے۔ میرے نزدیک عریانی اور فحاشی میں فرق ہے۔ عریانی اگر ایک سنجیدہ ادبی مقصد کے تحت ہو اور اس میں لذتیت کی آنچ نہ آنے پائے تو میں اسے جائز سمجھتا ہوں، مگر لذتیت مجموعی طور پر ادبی اعتبار سے لائق تحسین نہیں اور فحاشی تو بہر حال قابل اعتراض ہے۔ اپ ڈائیک کے متعلق ورشرن کی

فی کاپی: ۱۵ پیسے

قیمت سالانہ: ۵ روپے

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

اشاعت کی تاریخیں

۱، ۸، ۱۵، ۲۲

رائے دلچسپ تھی۔ اس نے اپ ڈایک کو مجموعی طور پر سراہا مگر اس ناول کے متعلق مجھ سے اتفاق کیا، ہاں اس نے یہ ضرور کہا کہ امریکہ کے ناول نگار موضوع کے مقابلے میں بڑی آزادی برتتے ہیں اور جو موضوع ان کے نزدیک ادبی رنگ میں پیش کیا جاسکتا ہے یا جس سے انسانی نفسیات پر روشنی پڑتی ہے اس کو برتنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں، اس لئے جنسی بے راہ روی، ہم جنسی، مشت زنی، آزاد پسندی پر جو ناول ادھر نکلے ہیں ان پر اسٹرن کو اعتراض نہ تھا اس کی رائے یہ تھی کہ ان کی ادبی قدر و قیمت صرف مصنف کی نظر، اس کی فنکاری، اس کے زبان کے استعمال، اس کی زندگی کے متعلق بصیرت سے ناپی جائے گی میں نے اسٹرن سے یہ سوال بھی کیا کہ آج امریکہ میں جنس سے اس قدر شغف کی کیا وجہ ہے۔ آخر دوسرے موضوعات بھی تو ہیں، اس کا جواب اس نے یہ دیا کہ امریکہ میں ادھر فرائڈ کے اثر سے نفسیات پر سب سے زیادہ توجہ ہے۔ سماجی مسائل بھی ناولوں میں آجاتے ہیں مگر نفسیات نے ناول کے فن کو متاثر کیا ہے۔ پلاٹ کا وہ تصور جو ایک اچھے قطع کئے ہوئے کپڑے کا ہوتا ہے، پرانا ہو گیا، کردار نگاری بقول میری میکارتھی ختم ہو گئی ادب کو محض ایک سماجی دستاویز سمجھنے والے کبھی کبھار ابھرتے ہیں مگر مجموعی طور پر امریکہ میں ان کو زیادہ بڑا ادبی درجہ نہیں دیا جاتا ہاں جو لوگ انسانی فطرت، ذہن، شخصیت کے رنگا رنگ پہلوؤں، لاشعور کی تہوں، زندگی کے وجودی نظریے پر زور دیتے ہیں وہ زیادہ مقبول ہیں۔ صرف سیاہ فام لکھنے والے ابھی قدرتی طور پر اپنے مسائل کی عکاسی میں سیدھی سادی حقیقت نگاری سے کام لیتے ہیں اور اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، مگر مجموعی طور پر اس میں بھی رمزیت اور اس کی بے ترتیبی میں ایک ترتیب اور اس کی بے معنویت میں ایک معنویت زیادہ اہم بھی جاتی ہے، اس رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے کیونکہ ادبی مسائل میں سنجیدہ اختلاف نہ صرف عام ہے بلکہ مستحسن اور صحت مند بھی ہے، مگر یہ رائے مجموعی طور پر اہم اور قابل غور ہے، میرے نزدیک امریکی ناول انگریزی ناول کے مقابلے میں زیادہ جاندار ہے نہ صرف وہ زندگی کی ساری پہنائیوں کو اسیر کرنا چاہتا ہے بلکہ زبان کے تمام پوشیدہ امکانات سے کام لیتا ہے اور خصوصاً ان حربوں سے جو اب تک شاعری میں استعمال ہوتے تھے، اکثر مدد لیتا ہے امریکہ میں فاکنر کے علاقائی میلان کا زمانہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے، مگر اس کی وہ اہمیت نہیں ہے، ہمنگوے سے اب بھی لوگ خاصے متاثر ہیں خصوصاً اس کے علامتی پہلو اور اس کی زبان کے ڈرامائی پہلو سے، مگر اس سے آگے بڑھ کر ناول اب میرے نزدیک ایسی سرحدوں میں داخل ہو رہا ہے جہاں وہ ناول رہتا ہی نہیں موجودہ ذہنی دنیا کے دھندلکے کی ایک ایسی تصویر بن جاتا ہے جس کے نقوش دھندلے اور بے ترتیب ہیں اور انہیں کے ذریعے سے وہ زندگی کی الجھن، ذہن کی بھول بھلیاں اور تصورات و جذبات کی باہم آویزش کو اسیر کرنا چاہتا ہے۔ (باقی)

صفحہ ۱۱ سے آگے

تھوڑا بہت اثر ملتا ہے۔ اردو اس سے بالکل بری ہے اردو کا سانچہ ایسا ہے اور اس کا اسلوب ایسا ہے کہ ایک یا دو منٹ میں جتنے الفاظ بولے جاسکتے ہیں اتنے شدھ ہندی شیلی کے الفاظ نہیں بولے جاسکتے۔ یہ ہے شہریت کی چستی:

"کیا اردو ادب میں ایک بدیسی عنصر نہیں ہے؟"

فراق صاحب کا جواب تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری میں بہت دنوں تک کچھ ایسی چیزوں کا حوالہ آتا رہا ہے جو بدیسی ہیں لیکن اردو شاعری میں ۵۰ ہزار ایسے اشعار ہیں جو بدیسی پن سے بالکل محفوظ ہیں لیکن جن میں طرز فکر شہری اور زمانہ حال کی ہے۔ ہندوستان بدل چکا تھا۔ سور، تلسی اور میرا کی بات چھوڑیئے ان عہد وسطیٰ کے شعرا کے یہاں دیہاتی ہندو زندگی کے لہجے ہم کو اس دھوکے میں ڈال دیتے ہیں کہ ساری ہندویت یہی ہے حالانکہ ہندو بدل چکا ہے وہ چاندنی چوک میں گھومتا پھرتا ہے اور مسلمانوں سے کھل کر ملتا ہے۔

میتھلی شرن گپت اور ان کے بعد ہندی شاعروں کی تخلیقیں دیکھئے۔ سور، تلسی کی صدا ان کے یہاں سنائی نہیں دیتی اگرچہ لفظوں سے جوڑ توڑ کر ان میں سنسکرت کے تت سم الفاظ کو زبردستی ٹھونسا گیا ہے۔ اردو زبان میں بہت سے امکان ہیں کوئی چاہے تو محض مسلم طرز فکر کا وسیلہ اردو کو بنائے اور چاہے تو عصری ہندوستانی شہریت کو نرم اور رنگ دار اور دلکش ذریعہ گویائی دے دے جیسا پریم چند نے کیا جیسا اردو کی رباعیوں اور دوسری تخلیقات میں میں نے کیا جیسا چکبست نے کیا جیسا بہت سے دوسرے شاعروں نے کیا

[illegible]

صفحہ ۱۲ سے آگے

پڑھ کر میں تو جھوم اٹھا۔

HOW IS IT, GHALIB, THAT YOUR GRIEF
RESSURECTED IN PIECES
HAS FOUND ITS WAY TO THIS ROOM
FROM YOUR DARK HOUSE IN DELHI.

اکبر علی خاں عرشی زادہ

مخطوطۂ گلِ رعنا بخطِ غالبؔ

غالبیات میں ایک اور بیش بہا دریافت

کسی نجومی نے کہا ہو یا نہ کہا ہو کہ یہ سال اچھا ہے مگر غالب دوستوں کی خوش نصیبی ہے کہ ابھی دو ماہ[1] قبل دیوانِ غالب کا وہ عجیب و غریب مخطوطہ دریافت ہوا جسے تمام و کمال غالب نے خود نقل کیا ہے اور ۲۴ رجب ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۱ جون ۱۸۱۶ء کا مکتوبہ ہے۔ اس وقت غالب کی عمر ۲۰ سال تھی۔ غالب دوستوں کو اس خبر سے بھی مسرت ہوگی کہ مذکورۂ بالا دریافت کے چند ہفتے کے اندر ہی ایسی ایک اور کتاب بھی دریافت ہوگئی جو بخطِ غالب ہے یعنی غالب کا "اولین انتخاب کلام ریختہ و فارسی موسوم بہ گلِ رعنا۔" یہ کتاب غالب نے کلکتے کے قیام کے دوران میں وہیں کے ایک دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر مرتب کی تھی چنانچہ اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے۔

"بامراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست
ورنہ غالب می گزد شوقِ غزلخوانی مرا

ہرچند زدلِ صید وامانگاہ و چیراتیم دودم فرو رفتہ تنشّب لاخ نادانی سہم در نوردِ دائرۂ ہر حرف سراز حلقہ دو سے بر می آرد و دکلم در کسوتِ ہر نقطۂ پشت دستے بر زمین می گذارد و تا خونگرمی اندازہ ہر یا نمش روا نادم کہ آتشِ افسردہ مرا شعلہ در ساخت و خاکِ زمیں گیر مرا علم رعنائی غبار ارزانی داشت زباں دادہ است کہ منتخبے از دیوانِ ریختہ و غزلے چند از پارسی در یک سفینہ باہم درآمیزم و ایں پردۂ دو رنگ بہ پیش طاق بینش نگارگیان یک رنگ آویزم۔

از و سے بزبان گفتن و از من بجاں پزیرفتن۔ نہفتہ نماناد کہ چوں در آغاز خارِ خارِ جگر کاوی شوقم بہ حرف نگارش اتحاد ارود و زبان بود و در مسلک اہل تحریر بر بیابان جادہ گزاردہ آمد، و بمیاں راہ سپردہ شد کہ مباد سر رشتہ از کف رود و کار از پرکار افتد۔ ہر آئینہ ایں چمنستان را دو در رو بر وی ہم کشودم و نخستیں در و ابہ اشعار ہندی بجز ہر آمودم و در دوم چوں آغوشِ شوقِ بروے پارسیاں وا ساخت و نام ایں سفینہ بزبانِ ادا شناس گلِ رعنا نہی ایں گلِ رعنا را گلدستۂ دستار جادہی و ہر کرا ایں راگرامی نہد پاسی از وے بر من نہی۔"

گلِ رعنا کی ترتیب کا زمانہ غالب کی بہت سی الجھنوں کا زمانہ تھا وہ اپنی خاندانی پنشن کا قضیہ سلجھانے کلکتے گئے تھے اس لئے سرو برگ آسائش کہاں میسر ہوگا۔ اس عالمِ پریشاں خاطری میں شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف بھی کیا سوجھتی غالب کے مندرجۂ بالا بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل اس بیان میں مبالغہ ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ ان افکار و آلام کے باوجود سفر اور مقدمے کی دھن ہوتے ہیں وہ شعر گوئی اور نثر نویسی سے کنارہ کش نہیں ہوئے تھے اور مذکورہ بیان کے خلاف دورانِ سفر میں بھی فکرِ سخن کرتے رہے چنانچہ نسخۂ شیرانی کے حاشیوں پر کچھ غزلیں ایسی بھی درج ہیں جو انھوں نے سفرِ کلکتہ کے ایک مقام باندہ سے دیوان میں اضافہ کرنے کے لئے ارسال کی تھیں اس کے علاوہ اور بھی شواہد موجود ہیں جن سے مندرجۂ بالا بیان مبالغے پر مبنی ہوتا ہے کسی کتاب کی ترتیب سکون تو چاہتی ہی ہے اس لئے غالب کا یہ بیان ان کے اور فرمائش کنندہ کے خصوصی تعلقات کا مظہر ہے کہ انھوں نے انتخاب و ترتیب کلام کی فرمائش کو پورا کیا۔

مطالعۂ غالب میں گلِ رعنا کی بڑی اہمیت ہے بالخصوص کلامِ ریختہ و فارسی کی تاریخی ترتیب اور فنی ارتقا کی منازل متعین کرتے وقت اس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ کلامِ ریختہ کی تاریخی ترتیب میں اس طرح کہ نسخۂ شیرانی سے جو کلام خارج اور گلِ رعنا میں شامل ہے وہ ۱۲۳۲ھ اور ربیع اول ۱۲۴۳ھ کی درمیانی مدت میں لکھا گیا ہے۔ مخطوطۂ دیوان اردو مکتوبہ ۱۲۳۱ھ میں شریک تیرہ فارسی رباعیوں اور نسخۂ بھوپال مکتوبہ ۱۲۳۷ھ میں شریک فاتحۃ الکتاب کو چھوڑ کر بقیہ فارسی کلام کی پہلی تاریخی حد بندی کرنے میں بھی گلِ رعنا کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ گلِ رعنا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب کے وقت تک کلامِ فارسی کی ردیف وار تقسیم و ترتیب نہیں ہوئی تھی چنانچہ حصۂ نظمِ فارسی کے آغاز میں ایک تمہیدی نثر گلِ رعنا میں پائی جاتی ہے۔ اس میں لکھا ہے۔

"ہنوز ایں گہرہائے شاہوار را برشتۂ نظمِ حروف تہجی نکشیدہ ام و ایں اوراقِ پراگندہ را شیرازۂ جمعیتِ تدوین نبستہ۔"

غالب نے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم کردی ہے پہلا حصہ انتخابِ ریختہ کا اور دوسرا حصہ انتخابِ فارسی کا ریختہ کو پہلا حصہ قرار دینے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ

"چونکہ میں اوّل اوّل ریختہ ہی میں فکرِ سخن کرتا تھا اس لئے اسی سے آغازِ انتخاب کیا۔"

---

[1] اس دریافت کو ایک سال سے کچھ زائد ہوگیا کہ قرب سال میں نے اس دریافت کی اطلاع ہماری زبان میں اشاعت کے لئے بھیج دی تھی جو شمارہ ۱۵ اگست ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب جلد ہی اس اہم مخطوطے کا عکس باضابطہ مقدمہ و حواشی شائع ہو رہا ہے۔

[2] اس مخطوطے کا عکس یکم ستمبر ۱۹۶۹ء میں تحفۂ عرشی زادہ کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

ان دونوں حصوں کو انھوں نے دو دور کہا ہے۔ دورِ اوّل اور دورِ دوم بعد کو آخری زمانے میں انھوں نے اپنے کلیاتِ نظم ونثر فارسی کا تتمہ مرتب کیا تو اس میں بھی دو دور قرار دئے اور اسی رعایت سے اس کتاب کا تو نام ہی "سبد باغ دو در" رکھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں یہ عنوان بہت پسند تھا۔

نسخۂ حسرت!

عرصے تک اس کتاب کا کوئی مخطوطہ دریافت نہ ہو سکا تھا طباعت کی تو کبھی نوبت ہی نہ آئی اور یہ سمجھا جاتا رہا کہ گلِ رعنا کا نام اور اس کے دیباچے اور خاتمے کی وہ عبارتیں جو غالب نے کلیاتِ نثر فارسی میں شریک کرلی تھیں باقی رہ گئی ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں مولانا حسرت موہانی مرحوم نے دیوانِ غالب مع شرح چھاپا تو گلِ رعنا کے حوالے سے چند غیر معروف اردو شعر بھی بطور ضمیمہ شریک کئے اور اسی موقع پر پہلی بار معلوم ہوا کہ گلِ رعنا ضائع نہیں ہوئی ہے۔ لیکن مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب غالب (طبع سوم ص ۳۸۳) میں کمیاب کتابوں کا تذکرہ کرتے ہوئے گلِ رعنا کے نسخۂ حسرت کے بارے میں یہ بتایا ہے کہ وہ کتاب کا صرف ایک حصّہ تھا جناب مالک رام نے بھی ایک موقع پر اس نسخے کا ناقص ہونا ظاہر کیا ہے۔

نسخۂ حسرت کے بارے میں میرا قیاس یہ ہے کہ کم از کم اس کا حصّۂ اردو مکمل تھا اس قیاس کی بنیاد یہ ہے کہ گلِ رعنا میں انتخاب اردو بہ ترتیب ردیف ہے حسرت نے اپنی شرح میں جو اشعار نقل کئے ہیں وہ بھی بہ ترتیب ردیف اور الف سے یا تک اکثر ردیفوں سے انتخاب ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر نسخۂ حسرت ناقص تھا تو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں پہلی تو یہ کہ درمیان کتاب میں کہیں کہیں سے اوراق ضائع ہو گئے ہوں دوسری یہ کہ فارسی کا حصّہ موجود نہ ہو۔

نسخۂ بلگرامی:

گلِ رعنا کے نسخۂ حسرت سے کوئی شخص استفادہ نہیں کر سکا اور اب ان کے انتقال کے بعد یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ نسخہ کہاں گیا اور یہ کہ موجود بھی ہے یا ضائع ہو چکا ہے۔ اس طرح غالب پر کام کرنے والے ایک بار پھر اس کتاب کے مندرجات سے محروم ہو گئے۔ تقریباً گیارہ بارہ سال ہوئے جناب مالک رام کو گلِ رعنا کا ایک اور مخطوطہ حیدرآباد کے کسی صاحب نے تحفے میں دیا اسی سے نسخۂ عرشی کی تاریخی ترتیب اور اختلافِ نسخ کے باب میں کام لیا گیا ہے۔[1]

نسخۂ بلگرامی کا زمانۂ کتابت!

نسخۂ بلگرامی کا زمانۂ کتابت ۱۲۵۳ھ یا اس کے بعد کا ہے اس لئے کہ اسی سنہ کے لگ بھگ غالب کا دیوانِ فارسی مرتب ہوا۔ نسخۂ بلگرامی میں آخری صفحہ پر بطور عنوان "خاتمہ دیوانِ فارسی" لکھ کر قلم زد کر دیا گیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ کاتب کا ارادہ مذکورہ عنوان کے تحت آنے والی تحریر کو بھی نقل کرنے کا تھا مگر خدا معلوم کس وجہ سے یہ نقل نہ ہو سکی۔

کاتب اس کی نقل کا ارادہ اسی وقت کر سکتا ہے جب یہ تحریر وجود میں آ چکی ہو اس لئے نسخۂ بلگرامی ۱۲۵۳ھ یا اس کے لگ بھگ زمانے کا نقل شدہ ہی مانا جا سکتا ہے۔ قیامِ کلکتہ کے زمانے کا نقل کیا ہوا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

نسخۂ سویدا!

اردو کے بہت سے اہم شاعروں میں مگر یہ خصوصیت غالب اور

سید فضل المتین

غزل

جو آشنا تھے وہ ہم سے نظر چرانے لگے
تمام خواب چلو اپنے اب ٹھکانے لگے

تھا جن کے واسطے میرا ہر ایک لفظ پیام
وہ بات بات پہ میری ہنسی اڑانے لگے

سنائے ہم نے جو روداد زندگی کہہ کر
تو تذکرے بھی حقیقت کے سب فسانے لگے

وہ یوں تو مجھ سے خفا بھی ہے اور برہم بھی
مگر جو دیکھوں اسے میں تو مسکرانے لگے

ہم اس کے ظلم و ستم کا کریں بیان کیسے
لگائے آگ کبھی اور کبھی بجھانے لگے

وجود جن کا مری ذات سے عبارت تھا
یہ وقت ہے کہ وہ آنکھیں ہمیں دکھانے لگے

عزیز تھے جنھیں ہم جو رفیق تھے اپنے
متین راہ میں کانٹے وہی بچھانے لگے

---

[1] جناب مالک رام صاحب نے اسے مرتب اور شائع فرما دیا ہے۔ اور اپنے دیباچے میں پہلی بار اس نسخے کے اصل مالک کا نام بھی جو عرصے تک پوشیدہ رہا ظاہر فرما دیا ہے یہ صاحب غالب کے دوست سید کرم حسین کے اخلاف میں سے ایک سید نقی بلگرامی ہیں اسی رعایت سے آئندہ اسے نسخۂ بلگرامی کہا جائے گا۔

صرف غالب کو حاصل ہے کہ ہر سال اور بعض اوقات سال میں کئی کئی بار اس کے بارے میں نیا تحقیقی مسالا اہلِ ذوق کے ہاتھ آتا رہتا ہے میں اپنے دوستوں سے اکثر کہتا ہوں کہ کسی اللہ والے نے غالب سے خوش ہو کر اسے یہ دعا دی ہے کہ "تیری کوئی تحریر ضائع نہ ہوگی" چنانچہ نسخۂ حسرت اور نسخۂ بلگرامی کے بعد حکیم اجمل خاں کے خاندان کے ایک صاحبِ علم فرد جناب غلام نبی سویدا کے پاس گلِ رعنا کا تیسرا نسخہ اسی سال نکل آیا۔ جناب محمد طفیل مدیر نقوش نے مجھے یہ تحریر فرمایا تھا کہ یہ مخطوطہ ناقص ہے۔

نسخۂ خواجہ:

اسے آپ کسی اللہ والے کی دعا کا اثر نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے کہ نسخۂ سویدا کے بعد چوتھا نسخہ بھی جو اب تک کے معلوم نسخوں میں سب سے زیادہ اہم، زیادہ قابلِ قدر اور زیادہ لائقِ اعتبار ہے دریافت ہو گیا یہ آج کل لاہور کے خواجہ محمد حسن صاحب کی ملکیت ہے اس اطلاع کے لئے میں اپنے کرم فرما دوست جناب سید معین الرحمن کا شکر گزار ہوں۔ انھوں نے اس اطلاع سے میری اس مسرت کو دوچند کر دیا جو حال ہی میں ۱۲۳۱ھ کے مخطوطۂ دیوان کی زیارت اور اس کے تفصیلی مطالعے سے مجھے حاصل ہوئی تھی موصوف نے یہ بھی کرم فرمایا کہ مجھے ازرہِ لطف نو دریافت مخطوطۂ گلِ رعنا کے عکس ارسال کئے ان عکسوں کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ نو دریافت نسخۂ گلِ رعنا وہی اصل نسخہ ہے جو پہلے پہل غالب نے اپنے قلم سے نقل کیا تھا غالب کی تصانیف کے معلوم مخطوطوں میں ۱۲۳۱ھ کے مکتوبہ دیوانِ اردو کے بعد یہ دوسرا مخطوطہ ہے جسے تمام و کمال بخطِ غالب ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اب فارسی و اردو کے تقریباً ۹۰۰ اشعار اور چند فارسی نثروں کی تصحیح ہو سکے گی اور بعض اہم اختلافات کا علم ہوگا۔

انداز خط اور املا:

زیرِ بحث گلِ رعنا کا انداز خط اور املا غالب کا جانا پہچانا ہے اس میں اور غالب کے قلم کی بعد کی تحریروں میں کوئی فرق نہیں یہ نستعلیق کے شفیعا خط کا بہترین نمونہ ہے اور بہت اہتمام سے قلم سنبھال کر لکھا گیا ہے اس لئے غالب کی بعض ایسی تحریروں سے جو روا روی میں قلم برداشتہ لکھ دی گئی ہیں زیادہ حسین اور پاکیزہ معلوم ہوتا ہے یہ عکس مجھے ملے تو میں نے مولانا عرشی کے ملاحظے میں پیش کئے موصوف نے بھی تصدیق فرمائی کہ بلاشبہ یہ غالب کا خط ہے۔

کیفیت:

معین الرحمن صاحب نے مطلع فرمایا ہے کہ اصل مخطوطے کا سائز ۵ انچ طول میں اور ۳ انچ عرض میں ہے جیسا کہ کہا گیا میرے سامنے اس کتاب کے عکس ہیں ان میں تمام اوراق کے دوسرے رخ کی تحریر کی ہلکی سی جھلک بھی نظر آرہی ہے اس کیفیت سے میرا اندازہ یہ ہے کہ مخطوطہ باریک بدیسی کاغذ پر نقل کیا گیا ہے۔ بدیسی کاغذ ملنے میں آسانی میسر آجاتا ہوگا۔ غالب عام طور پر ہلکے آسمانی یا ہلکے بادامی رنگ کا باریک بدیسی کاغذ استعمال کیا کرتے تھے اس مخطوطے کے کاغذ کا رنگ ہلکا بادامی ہے جیسا پرانا ہونے پر سفید کاغذ اکثر ہو جایا کرتا ہے۔ روشنائی سیاہ استعمال کی گئی ہے۔ کتاب کا مسطر پندرہ سطری ہے اس میں کتابت کا انداز کہیں موجودہ روش کے مطابق دائیں سے بائیں سیدھا سادھا ہے اور کہیں ترچھا یا حاشیہ دار دیوانِ غالب مکتوبہ ۱۲۳۱ھ میں پیشانیِ کتاب اور ترقیمے کے علاوہ تمام صفحات میں نقل کی بیاض نما روش ہی غالب نے برتی ہے۔

عکسوں کو بغور دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جگہ جگہ سے مخطوطے کے اوراق کناروں کے پاس مڑ گئے ہیں اور شیرازہ بکھر چکا ہے۔ اس لئے اس امر کی فوری اور اشد ضرورت ہے کہ مخطوطات کی جلد بندی کا تجربہ رکھنے والے کسی ماہر صحاف سے اس نسخے کی مرمت کرائی جائے چاروں طرف مضبوط کاغذ کا حوضہ لگوا دیا جائے ورنہ اس بیش قیمت کتاب کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہے گا۔ اس معاملے میں اگر ذرا سی بھی بے احتیاطی سے کام لیا گیا اور کسی کم تجربہ جلد ساز

ملاحت الاختر

غزل

میں روز ایک نئی داستاں بناؤں گا
پھر اس کے بعد خموشی میں ڈوب جاؤں گا

سکوں ملے گا مجھے مٹی کی کوکھ میں شاید
میں مر گیا تو کبھی لوٹ کر نہ آؤں گا

وہ ڈور ہے تو مرے ہاتھ میں رہے گی سدا
پتنگ ہے تو ہوا میں اسے اڑاؤں گا

جدا جدا ہیں لکیریں سبھی کے ہاتھوں کی
ہجوم میں بھی اکیلا ہی خود کو پاؤں گا

اگر نصیب ہوئی مجھ کو ایک بھی نیکی
میں اپنے سارے گناہوں کو بھول جاؤں گا

کے حوالے کر دیا گیا تو بالخصوص ادراق کے مڑے ہوئے کناروں کے الفاظ کا ضائع ہو جانے یا چھپ جانے کا خطرہ رہے گا۔ جو اس لئے افسوس ناک ہوگا کہ یہ کتاب غالب کے قلم کا نمونہ ہے۔ کتاب ایک ورق کے بقدر ناقص ہے اور یہ ورق پہلا ورق ہے اس لئے دیباچہ کتاب نامکمل ہو گیا۔ کل صفحات ۸۸ ہیں۔ آخر کے چھ صفحوں پر مثنوی باد مخالف نقل ہوئی ہے۔

تاریخ ترتیب :

بخط غالب ہونے کے علاوہ گل رعنا کے نسخۂ خواجہ محمد حسن کی ایک اور بہت اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس سے پہلی بار اس کتاب کی تاریخ آغاز ترتیب کا علم ہوتا ہے چنانچہ دیباچے کے آخر میں غالب نے غرہ ربیع الاوّل ۱۲۴۴ھ ہجری درج کی ہے اس تاریخ کو صمد دو سالہ التقویم مطبوعہ نول کشور کے مطابق جمعے کا دن اور ستمبر ۱۸۲۸ء کی بارہویں تھی۔ غالب ۲۰ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے تھے۔ اس حساب سے ابھی انھیں کلکتے میں مقیم تقریباً ساڑھے چھ مہینے کا عرصہ گزرا تھا کہ انھوں نے اس کتاب کی ترتیب کا کام ہاتھ میں لیا۔ گل رعنا کے نسخۂ بلگرامی میں اس مقام پر پنجم شوال درج ہے۔ نیز اعداد سنہ ترک ہو گئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے بعد میں تاریخ بدل دی ہے۔ ایسا انھوں نے کیوں کیا یہ بتانا مشکل ہے ویسے تاریخ بدلتے رہنے کی روایت غالب کی اور کتابوں میں ملتی ہے۔ ایک گمان یہ ہے کہ پنجم شوال کار ترتیب و نقل کے اختتام کی تاریخ ہو اور انھوں نے آئندہ آغاز کار کی تاریخ پر اختتام کار کی تاریخ کو ترجیح دی ہو۔

بظاہر مذکورہ دونوں نسخوں میں تاریخوں کا یہ اختلاف بتاتا ہے کہ نسخۂ خواجہ نسخۂ بلگرامی سے اقدم ہے اس کتاب کے معلومہ نسخوں میں نسخۂ خواجہ کا یہ ایک اور امتیاز ہے۔

نسخۂ خواجہ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ کار نقل کس تاریخ کو انجام پایا کتاب اتنی ضخیم نہیں کہ اس کی نقل کے لئے زیادہ مدت درکار ہو۔ پھر ایک دوست کی فرمائش بھی تھی اس لئے قدرتی طور پر تعمیل فرمائش میں عجلت ہی سے کام لیا گیا ہوگا۔ میری رائے میں اس کی نقل ڈھائی تین مہینے میں مکمل ہو جانا چاہئے۔ یعنی کار ترتیب و نقل ۱۸۲۸ء میں شروع اور اسی سال میں تمام ہو گیا ہوگا

مثنوی باد مخالف کی اوّلین روایت :

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا اس نسخے کے آخر میں مثنوی باد مخالف جس کا پہلا نام آشتی نامہ تھا نقل ہوئی ہے مگر یہ بخط غالب نہیں اور دو مختلف اشخاص کے قلم سے ہے ان میں سے دوسرا کم سواد ہے اس لئے کہ اس نے ایک شعر میں "وادی حرماں" کو "وادیِ حرماں" وغیرہ لکھا ہے۔ ان اشعار کی قرأت اور ترتیب مثنوی مذکور کی اس روایت سے تعلق رکھتی ہے جسے حکیم حبیب الرحمان خاں مرحوم (ڈھاکا) کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ غالب کے خطوط فارسی کے ایک مجموعے سے نقل کر کے جناب قاضی عبدالودود نے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن میسلنی جلد ۱ (آل آر اے سیریز نمبر ۱۳) بابت ۱۹۴۸ء میں شایع فرمایا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قاضی صاحب نے جو روایت درج فرمائی ہے۔ اس میں شعر نمبر ۲ کا پہلا مصرعہ "دے تے" اور گل رعنا میں "اے" سے شروع ہوتا ہے اسی جیسی چند اور مثالیں بھی ہیں۔ لیکن یہ بہت معمولی فرق ہے۔ اس کے برخلاف مروجہ شکل میں۔

اسد اللہ خان ہیچ مداں جادہ پیمائے وادی حرماں

کی جگہ قاضی صاحب کی شایع کردہ روایت اور نسخۂ گل رعنا کی روایت دونوں ایک ہیں یعنی

اسد اللہ بخت برگشتہ در غم و پیچ عجز سرگشتہ

اسی مثال پر مثنوی کے بقیہ اختلافات کو قیاس کر لیجئے۔

اس صورت حال سے پتا چلتا ہے کہ گل رعنا میں منقول روایت بھی مثنوی کی وہی اصل شکل ہے جس میں پہلے پہل یہ نظم ہوئی تھی مروجہ روایت کے پیش نظر جو اشعار بعد کا اضافہ ہیں جیسا کہ قاضی صاحب کا بھی خیال ہے اس مثنوی کو آشتی نامہ کے بجائے جنگ نامہ کہنا چاہئے چنانچہ اضافہ شدہ اشعار میں ایک یہ بھی ہے :

گرچہ بیدل ز اہل ایران نیست
لیک ہم چو قتیل نادان نیست

ظاہر ہے کہ قتیل کو آشتی نامے میں نادان نہیں کہا جا سکتا اور پھر وہ بھی کلکتے میں جہاں سارا جھگڑا قتیل کے حامیوں ہی سے تھا۔ اس لئے مثنوی میں ترمیم و اضافۂ اشعار کا کام اس دیار مخالف سے واپسی کے بعد ہی ہوگا۔

صفحہ ۹ سے آگے

نذیر حسین کے حلقۂ درس میں شریک رہے تھے۔

کتب خانہ نذیریہ کو میں نے کئی بار دیکھا ہے اس میں زیادہ تر مذہبی کتابوں کا ذخیرہ ہے لیکن دوسرے موضوعات پر بھی اہم کتابیں موجود ہیں یہ پہلے پھاٹک حبش خاں میں تھی جہاں میاں نذیر حسین مرحوم کا مکان تھا۔ پھر پہاڑی بھوجلہ پر منتقل ہوئی۔ سنا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کے لئے مرکزی حکومت سے پانچ ہزار سالانہ امداد مقرر کرا دی تھی لیکن کتب خانے کی حالت دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ اس پر ایک ہزار سالانہ بھی صرف ہوتا ہوگا۔ ضرورت اس کی ہے کہ یہ لائبریری کسی بڑی اور مرکزی حیثیت کی لائبریری میں مدغم کر دی جائے جہاں اس کی کتابوں کی حفاظت کا بہتر انتظام ممکن ہو۔

دہلی • مختار احمد فاروقی

دیویندر پرشاد سکسینہ

اردو کے ایک کرشن بھگت شاعر

منشی بنواری لال شعلہ

۲۴ اگست کو سارے ہندوستان میں شری کرشن جی مہاراج کا جنم دن منایا گیا ۔ یہ جنم دن ہر سال ہندوستانی بڑے شاندار پیمانے پر مناتے ہیں ۔ اس دن اردو کے ان کرشن بھگت شاعروں کی یاد آتی ہے جنھوں نے مرلی والے کی بھگتی میں اتنا کچھ منظوم لٹریچر ہماری زبان کو دیا ہے کہ اگر اس کا انتخاب شائع کیا جائے تو پانچ سو صفحات کی پانچ جلدیں تیار ہو سکتی ہیں ۔ آج میں ایک ایسے کرشن بھگت شاعر منشی بنواری لال شعلہ کا ذکر کر رہا ہوں جن کی کرشن بھگتی کی نظموں کا روزانہ صبح و شام مندروں اور گھروں میں لوگ بڑی عقیدت سے پاٹھ کرتے ہیں ۔

اکثر پڑھے لکھے لوگ جنھوں نے اردو میں ہندو کلچر کا مطالعہ نہیں کیا ہے یہ کہہ دیتے ہیں کہ اردو میں ہندو کلچر کا تلاش کرنا بالکل بیکار رہا ہے ، اس لئے میرا ارادہ ہے کہ میں اردو میں ہندو کلچر کے سلسلے میں پچاس سے زیادہ منظوم کتابوں کا تعارف ہماری زبان کے ذریعہ کراؤں گا اگر یہ سلسلہ اہل ذوق و ادب کو پسند آئے ۔ شعلہ کی کرشن بھگتی پر دو کتابیں " بزم بندرابن " اور " شری کرشن استتی " لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئی تھیں اور ہندوستان میں بھارت دھرم مہامنڈل نے مفت تقسیم کی تھیں لیکن دس سال کے درمیان اردو یا ہندی میں ان دونوں کتابوں کا کوئی اڈیشن شائع نہیں ہوا ہے ۔ آگرہ یونی ورسٹی نے کلیات شعلہ کا ایک ہندی اڈیشن پانسات سال ہوئے شائع کیا تھا لیکن اس اڈیشن میں کتابت کی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں ۔ پروفیسر آل احمد سرور ساری دنیا کے کرشن بھگتوں سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ وہ انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے شعلہ کے کلام کا انتخاب اور اردو کے کرشن بھگت شعرا " میری دو کتابیں شائع کر رہے ہیں ۔ پہلے میں شعلہ کی دو کتابیں " بزم بندرابن " اور " شری کرشن استتی " کا تعارف کراتا ہوں اس کے بعد ان کی کرشن بھگتی کی نظموں پر کچھ لکھتا ہوں :

(۱) " بزم بندرابن " اس کتاب میں شعلہ کے وہ شاعرانہ نغمے ہیں جو انھوں نے مرلی والے کی بھگتی میں سراپا ، اور سوز و ساز کے رنگ میں لکھے ہیں اس میں گوپیوں کے ہجر و غم ، راس منڈل دل فریبیوں اور ہنسی کی شوخ ادائیوں کے تذکرے ہیں جن کو پڑھ کر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے ۔ " بزم بندرابن " میں مثنوی کا انداز اختیار کیا گیا ہے ۔ لاکھوں کی تعداد میں کرشن بھگت اس مثنوی کا پاٹھ صبح اور شام مندروں اور گھروں میں کرتے ہیں ۔ " بزم بندرابن " کے اردو اور ہندی میں پندرہ اڈیشن میری نظر سے گذر چکے ہیں اس کتاب کے سلسلے میں غالب دہلوی منظومات شعلہ پر مقالہ لکھتے ہوئے رسالہ " آج کل " ۱۵ ستمبر ۱۹۴۲ء کے شمارے میں رقمطراز ہیں :

" بزم بندرابن نے تو شعلہ کو زندہ جاوید کر دیا ہے ۔ اردو داں سناتن دھرمی ہندو تو رامائن اور گیتا کی طرح اسے متبرک سمجھ کر اس کا روزانہ پاٹھ کرتے ہیں ۔ بعض کا یہاں تک عقیدہ ہے کہ تلسی کے سندر مانس چرتر کی طرح شعلہ کی " بزم بندرابن " بھی انسان کی دنیوی اور دینی اسباب راحت فراہم کرنے میں بہت ممد و معاون ہوتی ہے "

(۲) " شری کرشن استتی " اس میں شعلہ مرحوم کی وہ شاہکار نظمیں کرشن بھگتی کے سلسلے میں شامل ہیں جن کا پاٹھ صبح کے وقت اب بھی عقیدت سے سیکڑوں کرشن بھگت کرتے ہیں ۔ " کرشن استتی " کے پچاس سے زیادہ اڈیشن اردو اور ہندی میں شائع ہو چکے ہیں ، پندرہ سال ہوئے اس کا ایک ہندی اڈیشن علی گڑھ کے ایک کرشن بھگت نے راگھوب پرنٹنگ پریس علی گڑھ سے شائع کرایا تھا اس میں " دو شبد " کے عنوان سے یہ لکھا ہوا ہے :

" ان کی کرشن استتی آج بھارت کے ہزاروں ، یوں کو کنٹھ زبانی یاد ہے اور پربھات کی بیلا میں سیکڑوں گھر اس کی دھیان سے گونج اٹھتے ہیں "

اردو کے بعض ادیبوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اردو میں رامائن اور مہابھارت کی داستانیں تبرک کے طور پر ملتی ہیں اگر اردو کے منظوم لٹریچر کا اچھی طرح مطالعہ کیا جائے تو صرف رامائن اور مہابھارت کی داستانوں پر مشتمل پانچ پانچ ہزار کے دو انتخابات شائع کئے جا سکتے ہیں ۔ اس انتخاب میں شعلہ علی گڑھی کی منظومات کو بڑا ممتاز مقام حاصل ہوگا ۔ کرشن بھگتی اور رام بھگتی کے سلسلے میں کہنے والوں میں گورسہائے بلیغ ، نظیر اکبرآبادی ، فرحت لکھنوی ، شایاں لکھنوی ، خورشید لکھنوی ، برق دہلوی ، سرور جہاں آبادی کا خاص مرتبہ ہے لیکن جو مقبولیت شعلہ کو حاصل ہوئی وہ کسی کو نہیں ہوئی کیونکہ شعلہ کے یہاں جو والہانہ عقیدت اور شدت جذبات ملتی ہے وہ دوسروں کے یہاں نہیں پائی جاتی ۔ حضرت جگر بریلوی " یادِ رفتگاں " میں شعلہ کی کرشن بھگتی کی نظموں کے سلسلے میں رقمطراز ہیں :

" ہندوؤں میں آپ کے کلام کو خاص مقبولیت حاصل ہے ، اس کا راز آپ کے وہ شاعرانہ نغمے ہیں جو آپ نے اقلیم حسن کے تاجدار مرلی والے کی شان میں گائے ہیں ۔ ایک دیوان غزلوں کا بھی ہے جس میں کم و بیش دو ہزار اشعار ہیں مگر جس چیز نے اب تک آپ کا نام زندہ رکھا ہے وہ کرشن کنھیا کی جاں بخش شیریں کاریاں

اور سرور انگیز کارفرمائیوں کے راگ ہیں۔"

کرشن بھگتی کے سلسلے میں آپ کی شاہکار مثنوی "بزم بندرابن" اردو ادب میں یقیناً ایک یادگار کارنامہ ہے۔ "بزم بندرابن" اردو مثنوی نگاری میں بھگتی اسکول کا آغاز کرتی ہے جس کے نمائندے برقؔ دہلوی، رونقؔ دہلوی، تمیزؔ دہلوی، شیداؔ دہلوی، جگرؔ بریلوی، مسرورؔ لکھنوی وغیرہ ہیں۔ شفقؔ کی مثنوی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں بیانیہ شاعری میں استادی کا درجہ حاصل تھا۔ پوری مثنوی میں بڑی پختگی، شگفتگی اور روانی ہے۔ حضرت جگرؔ بریلوی "یادِ رفتگاں" میں اس مثنوی کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"شری کرشن جی کی بھگتی میں بالکل رنگ گئے۔ ڈوب ڈوب کے قلبی کیفیتوں اور حسن عالم افروز کی کرشمہ سازیوں کے ترانے سنانے لگے۔ وہ ترانے جن پر روح وجد کرتی ہے اسی رنگ کی آپ کی ایک مستقل تصنیف "بزم بندرابن" ہے جسے پریم کے پجاری حرزِ جان بنائے رکھتے ہیں اور اس کے بعض حصوں کا بڑی عقیدت سے روزانہ پاٹھ کرتے ہیں۔ شاعری کے تمام جوہر اصلی آب و تاب کے ساتھ اس تصنیف میں نمایاں ہیں جوش، رنگینی، مصوری، برجستگی، شدت و لطافت جذبات سبھی کچھ ہے۔ البتہ زبان میں ہندی کی آمیزش زیادہ ہے۔ بزم بندرابن کی ابتدا اس جوش سے ہوتی ہے جیسے پہاڑ سے آبشار ابلتا ہے۔"

اب اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شری جگدیش برندابن بہاری
شری رادھا رمن مادھو مراری
شری گوبند رادھا کرشن گوپال
مدن موہن شری گھنشام نند لال
شری مرلی منوہر شیام سندر
شری بھگوان گوپی ناتھ گردھر
شری جدپت شری بانکے بہاری
چتر بیچ شیام مورت چکر دھاری
مکٹ دھاری مدن گوپال موہن
نول سندر چھبیلے لال موہن
تو ہی ہے حسن رخسار حقیقت
تو ہی ہے پردہ بردار حقیقت
تو ہی ہے جلوہ فرمائے دو عالم
تو ہی ہے خود تماشائے دو عالم
تو ہی ہے پروانہ تو ہی شمع محفل
تو ہی مجنوں تو ہی شورِ عنادل

بت چت چور ماکھن کے لٹیرے
حیات و موت دونوں کھیل تیرے
نمود آفرینش ہے تجھی سے
وجود آفرینش ہے تجھی سے
الگ کب مجھ سے تیری گفتگو ہے
غرض ایک تو ہی تو ہے تو ہی تو ہے

شفقؔ نے مرلی والے سے درشن دینے کی تمنا یوں ظاہر کی ہے:

کدم کی چھاؤں ہو جمنا کا تٹ ہو
ادھر مرلی ہو ماتھے پر مکٹ ہو
کھڑے ہوں آپ اک بانکی ادا سے
مکٹ جھونکوں میں ہو موجِ ہوا سے
کسی نازک کمر ہو کا پچھنی سے
بندھی جیسی ہو جامے کی تنی سے
بھری گجروں سے ہو نازک کلائی
بنے ہوں برگِ گل دستِ حنائی
برابر ہوں شری رادھا کشوری
مدھر تر بانس کی بجتی ہو پوری
تبسم ہو دمِ نظارہ باہم
عیاں اک چھب میں ہو حسنِ دو عالم
جدا ہوں گو برائے نام دونوں
بنے ہوں ایک رادھا شیام دونوں
ہم دیگر ہو عکسِ حسن زیبا
کنھیا رادھا ہوں رادھا کنھیا

شفقؔ اردو کے غالباً پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مرلی والے کی جنم بھومی متھرا کی شان میں "برج رج" کے عنوان سے پورا ایک مسدس لکھا ہے اس مسدس کے دو بند ملاحظہ فرمایئے۔

یہ وہ ہے زمیں جس کو زمیں کہہ نہیں سکتے — اونچا ہی پر عرش بریں کہہ نہیں سکتے
روشن ہے کہ سجدہ گہِ اہلِ یقیں ہے — جو ذرہ ہے یہاں خاتمِ قدرت کا نگیں ہے

اٹھا ہے یہیں آ کے نقابِ رخِ توحید — ہر وقت نظر آتا ہے یاں جلوۂ جاوید
چھپتا نہیں ہے شام کو بھی برج کا خورشید — ایک ماہ میں یاں تیس نکلتے ہیں مہِ عید
آتی ہے ہنسی ذروں کو تاروں کی جھلک پر
یہ وہ ہے زمیں پاؤں نہ رکھے جو فلک پر

مراسلات

ہوتے تک

غالب کی غزل "آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک" کے بارے میں بعض حضرات کو اصرار ہے کہ اس غزل کی ردیف میں ہونے تک پڑھا جائے۔ ان حضرات کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے جیسے غالب کے معاصر قلمی و مطبوعہ نسخوں میں ہوتے تک کاتب کی غلطی ہو۔

حسن اتفاق ہے کہ دیوان مومن میں بھی ایک غزل اسی ردیف کی باختلاف قافیہ موجود ہے اور مومن نے بھی ہوتے تک ہی استعمال کیا ہے چنانچہ ۱۲۸۸ھ کی طبع مطبع ہاشمی میرٹھ اور ۱۲۸۳ھ کی طبع مطبع نولکشور دونوں میں ہوتے تک ردیف ہے یہی حال رامپور میں موجود قلمی نسخوں کا ہے۔

غالب کی معاصر اس مثال سے یقین ہو جاتا ہے کہ غالب نے ہوتے تک ہی لکھا تھا اور اس صورت میں غالب کے کسی بھی پڑھنے والے کو اپنے عہد کے مطابق اصلاح کر کے پڑھنے کا حق نہیں پہنچتا بصورت دیگر تمام قدما کی زبان کو جدید بنانا پڑے گا جو ظاہر ہے کتنا بڑا ظلم ہوگا۔

رامپور • اکبر علی خاں عرشی زادہ

پھر وہی لکھاوٹ کی بات

کہتے ہیں کہ ایک راجا کے ۹ بیٹے تھے۔ سب سے چھوٹا بیٹا نہایت خوبصورت تھا کچھ لوگ اس سے جلتے تھے اور اس کے خلاف ہمیشہ سازشوں میں لگے رہتے تھے۔ ایک دن راجا نے بغرض امتحان تمام بیٹوں کو شکار پر بھیجا۔ جیسے ہی راجا کے بیٹے روانہ ہونے لگے چھوٹے بیٹے کے دشمنوں نے اسے گھیر لیا اور اس سے کہنے لگے کہ یہ لباس اچھا نہیں ہے، یہ گھوڑا ٹھیک نہیں ہے، یہ جوتے بھی مناسب نہیں ہیں، وغیرہ۔ نتیجہ معلوم۔ چھوٹا بیٹا ان کے بہکانے میں رہ گیا اور بقیہ راجکمار شکار سے لوٹ بھی آئے۔

بالکل یہی حال آج اردو کا ہے۔ اردو والے سال بھر رسم خط کی فضول بحث میں اپنی توانائی ضائع کرتے رہتے ہیں اور دوسری زبان والے ایک سے ایک لغت انسائیکلوپیڈیا اور حوالہ کی دوسری اہم کتابیں شائع کرتے رہتے ہیں۔

اگر ہندوستان میں اردو کے تحفظ و بقا سے واقعی آپ کو دلچسپی ہے تو پھر تعلیمی محاذ پر ڈٹ جایئے اور اردو کو اس محاذ پر جو پسپائی ہو رہی ہے، اس کو دور کرنے کی کوشش کیجئے، یاد رکھئے، اگر اردو کا موجودہ خط بدلا گیا تو اس کا نحوی ڈھانچہ مسمار ہو کر رہ جائے گا۔

اور اگر آپ واقعی نیک نیتی سے خط بدلنے کا مشورہ دے رہے ہیں تو پھر ناگری ہی کیوں، اس کے علاوہ بھی، اور اس سے کہیں اچھے، رسم خط دوسری زبانوں کے ہیں۔ کہیں خط بدلنے کے مشورے کے پیچھے کوئی سامراجی ہاتھ تو نہیں؟ سچ پوچھئے تو اردو کے دشمنوں کو پہچاننے کا یہی ایک مجرب نسخہ ہے۔

• اقبال کرشن

تحقیق صداقت

"ہماری زبان" (مورخہ ۱۵/اگست ۱۹۸۰ء) میں جناب کاوش بدری صاحب کا ایک مضمون "صوبہ مدراس میں اردو زبان و ادب کا سرسری جائزہ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ قابل مضمون نگار نے اپنے مختصر جائزے میں وہاں اردو کی کس مپرسی کی بڑی اچھی تصویر کھینچی ہے جنوبی ہند کے صوبہ جات آندھرا پردیش اور میسور میں اردو کے متوالے اپنی آوازیں اٹھاتے رہتے ہیں۔

کاوش بدری صاحب کا جائزہ بھی ایک اونچی آواز ہے، اگر ایسی ہی آوازیں متعدد بار اٹھتی رہیں تو یقیناً مدراس کے اردو داں حضرات اس شیریں زبان کو زندہ رکھنے کے لئے آگے بڑھیں گے۔

اس مضمون میں مدراس کے افسانہ نگاروں کی فہرست میں راقم الحروف کا بھی نام دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ میں حیدرآباد کے قریب ضلع ورنگل (آندھرا پردیش) کا رہنے والا ہوں اور تقریباً دس سال سے بھوپال میں سکونت پذیر ہوں۔ بھوپال کے علم دوست احباب اور بزرگوں نے مجھے ادبی تربیت دی۔ میرے افسانے تحقیقی مضامین اور مزاحیہ مضامین لکھنؤ، دہلی، بھوپال اور حیدرآباد کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے اگر مجھے مدراس کے افسانہ نگاروں میں شمار نہ کیا جائے تو یہ ایک تحقیقی صداقت ہوگی۔

بھوپال • فضل جاوید، ایم۔ اے

نذیریہ لائبریری

ہماری زبان (۲۲/اگست) میں انگریزی اخبار انڈین ایکسپریس کے حوالے سے ایک خبر بعنوان "نذیریہ لائبریری کی حالت زار" شائع ہوئی ہے اس میں لکھا ہے کہ "یہ لائبریری ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی نایاب کتابوں پر مشتمل بمو جب پہاڑی دہلی کے ایک گمنام گوشے میں واقع ہے۔"

مجھے اس بارے میں یہ عرض کرنا ہے کہ اس کتب خانے کا ڈپٹی نذیر احمد مرحوم (مصنف توبۃ النصوح وغیرہ) سے کوئی سروکار نہیں یہ مشہور عالم اور محدث میاں "نذیر حسین دہلوی کا ذخیرہ ہے میاں نذیر حسین اپنے عہد کے جید علما میں تھے اور پنجابی کڑہ کی ایک مسجد میں ان کا مدرسہ تھا۔ یہ مسجد اس جگہ واقع تھی جہاں اب دہلی جنکشن کا علاقہ ہے اسے ۱۸۵۷ء کے بعد مسمار کر دیا گیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے زمانہ طالب علمی میں یہاں سبق لیا ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی بھی میاں

(باقی صفحہ ۱۹ کالم ۲)

اخبار و افکار

اردو گھر کی تعمیر کے لئے انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کو چار لاکھ روپے کی گرانٹ

نئی دہلی۔ ترقی اردو بورڈ نے ترجمے اور تصنیف کے لیے ۵۰۰ اردو کتابوں کو منتخب کیا ہے۔ مرکزی وزارت تعلیم نے یہ بورڈ بنایا تھا تاکہ اردو میں تعلیمی لٹریچر کو فروغ دیا جائے جو ایک اہم غیر ریاستی زبان ہے۔ ۳۱۰ کتابیں ترجموں اور تصنیف کے لئے دی جا چکی ہیں اس کے علاوہ ترقی بورڈ نے مختلف اداروں کو ۴۴ ایسی کتابیں پھر سے شائع کرنے کے لئے دی ہیں جو اب نایاب ہیں۔ وزارت تعلیم اشاعت اور تحقیقاتی کاموں کے لئے مختلف اداروں کو بھی مدد دیتی ہے حال ہی میں انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کو دلی میں اردو گھر کی تعمیر کے لئے چار لاکھ روپیہ کی گرانٹ منظور کی جا چکی ہے۔ اردو گھر کو اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے تعمیر کیا جائے گا۔

• الجمعیۃ دلی

ہندستانی زبانوں کی ترقی کے لئے امداد

نئی دہلی: وزارت تعلیمات کی ہندی اور سنسکرت کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں کی ترقی کی اسکیم چوتھے پنجسالہ منصوبہ کے دوران جاری رہے گی۔

اسکیم کے تحت رضاکار ادارے سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ تعلیمی اداروں یا خیراتی اداروں کے قانون کے تحت رجسٹرڈ ادارے مالی امداد کے مستحق ہوں گے۔

• قومی آواز لکھنؤ

امتیاز علی تاج کے ملازم اور اشتہاری ملزم جارج کو گرفتار کر لیا گیا

لاہور، سی۔آئی۔ڈی نے گذشتہ دنوں نامور ادیب سید امتیاز علی تاج کے قتل کے الزام میں جن دو افراد کو گرفتار کیا ان میں ایک مرحوم کا سابق نجی ملازم جان محمد عرف جارج ہے جس کی گرفتاری میں مدد دینے والے کو پولیس نے دو ہزار روپیہ دینے کا اعلان کیا تھا پولیس حکام نے اس کی گرفتاری کی مدد دینے والے کو دو ہزار روپے دینے کا اعلان کیا۔ پولیس حکام نے اس کی گرفتاری کی تصدیق کی تاہم اس سلسلہ میں پکڑے جانے والے دوسرے ملزموں کے نام تا حال صیغہ راز میں ہے۔

ایک اطلاع کے مطابق جارج کے علاوہ تھامس سید صاحب کا سابق ملازم تنویر بدمعاش بھی سی۔ آئی۔ ڈی کی حراست میں ہیں اور ان سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے بتایا جاتا ہے کہ تھامس نے جان محمد سے دوستی کر رکھی تھی اور اس کا نام جارج رکھا تھا۔ پولیس نے صرف جان محمد کے بارے میں معلومات فراہم کیں اور اس واردات سے متعلق دوسری تفصیلات بتانے سے معذوری ظاہر کی جان محمد جارج کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ پنڈ دادن کا رہنے والا ہے گوجی شاہ کا ایک بدمعاش شخص تھامس اسے وہاں سے لایا تھا اور اس کے نام کے ساتھ جارج لگا دیا تھا تاکہ لوگ اسے بھی تھامس کی طرح عیسائی سمجھیں۔

• سیاست

انجمن ترقی اردو کا کامیاب طرحی مشاعرہ

دلی۔ انجمن ترقی اردو دلی کے زیر اہتمام جشن آزادی کے سلسلہ میں طرحی مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ یہ مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات جناب آئی۔ کے گجرال کی صدارت میں مولانا آزاد لائبریری ہال میں منعقد ہوا۔ جناب گجرال نے اردو زبان کے سلسلہ میں مشکلات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بات کی تحسین کی کہ اردو کے شعراء ادیب ملکی مسائل کی طرف سے غافل نہیں رہے ہیں آج ملک کو جو مسائل درپیش ہیں ان کی طرف بھی اردو شاعروں اور ادیبوں کو اتنی ہی توجہ دینی چاہیے۔

• الجمعیۃ دلی

انجمن ترقی اردو سنگاریڈی کی صدر جمہوریہ سے نمائندگی

حیدرآباد۔ صدر جمہوریہ ہند جناب وی وی گری سے راشٹرپتی نیلایم میں کل انجمن ترقی اردو سنگاریڈی کے صدر جناب ایم نرسمہا ریڈی، نائب صدر محمد حسین خاں اور کے کرشنا چاری نے ملاقات کرتے ہوئے ایک یادداشت پیش کی جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل ہال و لائبریری سنگاریڈی میں قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ صدر نے فوری امداد کا تیقن دیا۔

• رہنمائے دکن

فراق گورکھپوری سے ایک انٹرویو!

(متعدد اخبارات میں فراق گورکھپوری سے جناب انجنی کمار سریواستو کا انٹرویو شائع ہوا ہے۔ چونکہ ہندی اردو کے مسئلے پر اس سے خاصی روشنی پڑتی ہے اس لئے قارئین ہماری زبان کی دلچسپی کے لئے ہم بھی اس کا خلاصہ ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ ادارہ)

فراق صاحب کے بنگلے کے لان پر میری ان سے ملاقات ہوئی۔ مزاج پرسی کے بعد انھوں نے میرے آنے کا سبب دریافت کیا۔ میں نے کہا "آپ کو گیان پیٹھ انعام ملا ہے اس خوشی کے موقع پر آپ کو مبارکباد دینے آگیا ہوں حضور"۔

اس ملاقات کے دوران میں چند سوال آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا جواب میں جلدی جلدی لکھتا چلوں گا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کروں، فراق صاحب خود بول پڑے۔ "ہندی اور اردو زبان میں فرق کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ہندو مسلمانوں کو آپس میں ٹکرانے کے لئے" انھوں نے کہا "میرے اس انعام کا ہندی جگت نے دل کھول کر خیر مقدم کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو ہندی کا فرق و اختلاف ایک بناوٹی چیز ہے"۔

فراق صاحب بھارتیہ گیان پیٹھ کے انعام کا اعلان ہونے کے بعد آپ پر اس کا کیا ردعمل ہوا؟

فراق صاحب نے کہا "انعام کو لوگ دو نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اعزاز اور رقم۔ تم جانتے ہو کہ میں ۷۰ برس کا ہو گیا ہوں۔ یہاں سے پاکستان تک کروڑوں لوگ پہلے ہی سے میری شاعری کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔

رہی رقم کی بات، وہ میرے اخراجات کے مسئلے کو سلجھانے میں میری مدد کرے گی۔

میرا دوسرا سوال تھا۔

"اپنی شاعری میں آپ کا نصب العین کیا رہا ہے؟"

فراق صاحب نے فرمایا "ہندوستانی فکر و شعور میں گہرائی گمبھیری پیدا کرنا، قاریوں کو ایک نیا شعور زندگی دینا، محبت، حسن اور زندگی یا دنیا کی دوسری باتوں کی انسانی اپیل لوگوں کو محسوس کرانا، میرا خاص مقصد رہا ہے۔" یہ کام اسی حالت میں ہو سکتا ہے، جب شاعری کو ایک نئی آواز دی جائے۔ اسی آواز کی تخلیق میرا مقصد رہا ہے"۔

اس کے بعد میں نے سوال کیا۔

"اردو زبان کا ہمارے سماج کے تاریخی ارتقا میں کیا مقام ہے؟ کچھ اس پر روشنی ڈالیں"۔

فراق صاحب کہنے لگے۔ "آج سے لگ بھگ ایک ہزار برس پہلے یہاں مسلمان آئے اور ان کی سلطنت قائم ہوئی۔ اس سے کوئی سو برس پہلے ہندو سماج اپنی طاقت کھو چکا تھا اور اپنے ہی خول میں سما کر اس سماج نے پناہ لی تھی یعنی ہمارے شہر مٹ چکے تھے نظام تعلیم مر چکا تھا اور ہم سب دیہات میں محض دیہی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسلام ایک بڑے شہر میں پیدا ہوا اور جب مسلمان ہندوستان آگئے تو شہریت کا احیا ہوا۔ اس کام کا مرکز دلی تھی۔ ہزار سال پہلے دلی کی بولی جاٹوں کی بولی تھی۔ پالی ٹوٹ کر پچھمی ہندی بن رہی تھی۔ لیکن اس بولی میں لوچ یا لچک نہیں تھی۔ یہ بڑی اکھڑ بولی تھی۔ اسی سے آج بھی اسے کھڑی بولی کہا جاتا ہے۔ مسلمان گنواروں کو بھی یہ بولی اپنانا پڑی لیکن ایسا ہونے سے وہ بولی رفتہ رفتہ زبان بن گئی۔ لوچ دار اور لچک دار ہو گئی اور اس میں ایک دلکش اسلوب پیدا ہو گیا۔ ہر زبان زندگی کی ایک صدائے بازگشت ہوتی ہے۔ لیکن اردو میں تخلیق ادب اس وقت شروع ہوئی جب پہلے کئی سو برس تک گھروں میں، دفتروں میں، بازاروں میں، درباروں میں بولی کی حیثیت سے اردو بولی جاتی رہی۔ ہاں آج سے دو سو برس پہلے گجرات کا شاعر ولی دکنی غزلوں کا دیوان تیار کر کے دلی آیا تب پہلے پہل دلی کے کچھ لوگوں کو یہ سوجھ لی کہ اردو کو تخلیق ادب کا وسیلہ بنایا جائے۔ سب سے بڑی خصوصیت اردو ادب کی یہ ہے کہ کئی سو برس تک سبھی چھوٹے بڑے ادب کی اس زبان کو بولتے رہے تب اسے ادب کا روپ دیا گیا۔ اب آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ اس بولی کی کیا خصوصیت تھی؟ سب سے اہم خصوصیت اس بولی کی یہ تھی کہ بدویت کا بھدا پن اس میں نہیں تھا۔ اس میں ایک نزاکت تھی، لطافت تھی، ہلکا پھلکا پن تھا، ایک تیور تھا، ایک بانکپن تھا اور مدنیت کی صدا تھی عوام کی اس زبان میں مدنیت رچ بس گئی تھی۔ بولی تھی جاٹوں کی اکھڑ، کھردری اور بے کشش اب یہ بن گئی نرم، نازک، رچی ہوئی اور طرح طرح سے سنوری ہوئی۔ اردو شاعری میں بیسیوں ہزار ایسے شعر ہیں جو سو فی صدی ہندی تدبھو لفظوں سے بنے ہیں۔ ایک اور بات ہے کھڑی بولی نے دلی میں جو روپ اختیار کیا تھا اس میں کئی حروف ساکن ہوتے ہیں، سنسکرت میں ایسا نہیں ہے۔

اردو نے حروف تہجی کو ساکن شکل میں بولنا شروع کیا اور اس سے زبان و ادب میں ایک چستی اور ہلکا پن آگیا۔ بھگتی واد اور سنت واد کا ادب اور زندگی یہاں پھلتی پھولتی رہی۔ جب اردو شاعری شروع ہوئی تو خالص مادی اور دنیاوی تھی اور مذہب کی جکڑ بندیوں سے بالکل آزاد تھی۔ ریت کال کی ہندی شاعری میں بھی مادیت آچکی تھی۔ جب اردو میں مادیت آئی تو اسے پر لگ چکے تھے پھر شہریت نے دماغوں کو ایک نئی چستی، چالاکی اور چابکدستی دے رکھی تھی یہی ہے اردو کی شہریت آج تک اردو کو چھوڑ کر ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بدویت اور گنوارپن کا

(باقی [illegible])

آل احمد سرور

میرا صفحہ

امریکہ سے پانچ سال سے جنوبی ایشیا کے ادب کے متعلق ایک سہ ماہی رسالہ محفل کے نام سے نکلتا ہے۔ رسالہ انگریزی میں ہے اس کے ایڈیٹر کارلو کوپولا، امرجیت دلالی اور چودھری محمد نعیم ہیں لیکن دراصل زیادہ تر کام نعیم ہی کرتے ہیں اس رسالے نے کئی خاص نمبر نکالے ہیں جن میں تامل ادب نمبر اور امریتا پریتم نمبر خصوصاً قابل ذکر ہیں، اس میں اردو شاعری اور اردو کی کہانیوں کے اچھے اور صاف ستھرے ترجمے برابر شائع ہوتے رہتے ہیں، دوسری ہندوستانی زبانوں کے ادب کے تراجم بھی نکلتے رہتے ہیں، مارچ ۷۰ء میں اس کا غالب نمبر شائع ہوا ہے، جو کئی خصوصیات کی وجہ سے قابل قدر ہے۔ شروع میں غالب کے خطوط کے تیرہ اقتباسات کا ترجمہ ہے جن سے غالب کی شخصیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ابھرتی ہے۔ اس کے بعد غالب پر دو پرانے مضامین کا ترجمہ ہے، پہلا مضمون پروفیسر احتشام حسین کا غالب کی فکر کے عناصر کا جائزہ ہے، دوسرا ڈاکٹر محمد حسن کا غالب کے کچھ اہم نقادوں کے متعلق ہے، یہ دونوں مضمون غالب پر تنقیدی سرمائے میں اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مضمون غالب اور ۱۸۵۷ء کے متعلق ہے جس کا ترجمہ ان کی ایک شاگرد نے انگریزی میں کیا ہے۔ نارنگ کا یہ خیال صحیح ہے کہ دستنبو سے غالب کے ۱۸۵۷ء کے متعلق اصلی رائے کا پورا اندازہ نہیں ہوتا اس سلسلے میں ان کے خطوط کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے۔ غالب سیاسی آدمی نہ تھے۔ انھیں مغل دربار سے کوئی ذہنی عقیدت نہ تھی۔ وہ اس کا انجام جانتے تھے۔ نئے مغربی اثرات کے متعلق ان کا رویہ ہمدردانہ تھا، مگر وہ اپنے گردوپیش تباہی اور ایک تہذیبی مرکز کی بربادی پر کس طرح نہ کڑھتے۔ غالب کے خطوط میں دلی کی بربادی کا جو مرثیہ ہے وہ بہت سی نظموں پر بھاری ہے ہاں باغیوں سے یا ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے سے انھیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ نارنگ کے مضمون میں پوری بات خاصی وضاحت سے کہدی گئی ہے، اس کے بعد اعجاز احمد کا ایک دلچسپ مضمون ہے جس کا عنوان "لالے پر قطرۂ شبنم" ہے اعجاز احمد بڑے ذہین نوجوان ہیں۔ انھوں نے میراجی کی نفسیات پر سویرا میں ایک بہت اچھا مضمون کئی سال ہوئے لکھا تھا۔ انھوں نے بعض مغربی شعرا کی نظموں کے بڑے رواں اور شگفتہ ترجمے کئے ہیں اور خود بھی اچھا شعر کہتے ہیں۔ اردو دنیا کو ان کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے غالب کی چالیس غزلوں کا لفظی ترجمہ کرکے دس بارہ امریکن شعرا کو دعوت دی کہ وہ اس ترجمے کی روشنی میں اپنے طور پر غالب کے اشعار کو انگریزی میں ڈھالیں۔ خلاف توقع کئی ممتاز امریکن شعرا کو ترجمے کے بادل میں بھی غالب کی فکر عالم تاب کی کچھ ایسی کرنیں نظر آئیں کہ وہ چونک پڑے۔ چنانچہ آدھے درجن شعرا نے جن میں ولیم اسٹفورڈ، ایڈرین ریچ، ولیم میرٹ، ڈبلیو ڈی مرون جیسے ممتاز شعرا شامل ہیں ترجمے کئے، جو علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہوں گے۔ اس مضمون میں انھوں نے اپنے کاروبار شوق کی داستان بیان کی ہے اور ترجمے یا تخلیق ثانی یا منزل کے قریب پہنچنے کے مسائل کا ذکر کیا ہے۔ ایلیٹ کا یہ قول درست ہے کہ ایک زبان کی شاعری کا دوسری زبان میں مکمل ترجمہ نہیں ہو سکتا، مگر یہ کوشش تو ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہنی چاہئے کیونکہ روح ہاتھ نہ آئے نہ سہی، قالب کے ذریعہ سے بھی روح کا کچھ سراغ مل سکتا ہے اور بہر حال چراغ سے چراغ تو ہمیشہ جلتے ہیں اور زبان کی دشواریوں کے باوجود ایک فنکار دوسرے کے باطن میں جھانک تو سکتا ہے۔ یہ مضمون اور اس کے بعد رالف رسل کا مضمون جس میں غالب کے ترجمے کے مسائل بیان کئے گئے ہیں میرے نزدیک نہایت اہم ہیں، رسل کا ترجمے کا تصور اعجاز کے ترجمے کے تصور سے مختلف ہے، اعجاز رنگ کو جذب کرنے پر زور دیتے ہیں، رسل چونکہ ایک معلم ہیں اس لئے وہ روح اور قالب دونوں کا خیال رکھتے ہیں۔ رابرٹ بلائی، ڈبلیو ایس مرون آئیور، نارمن زائڈ کے تراجم بھی اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں چودھری نعیم نے جس طرح غالب کی متعدد غزلوں کا ترجمہ کیا ہے اس سے یقیناً اردو نہ جاننے والوں کو غالب کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی برائن سلور نے غالب پر انگریزی میں مواد کی بہت اچھی فہرست تیار کی ہے۔ اس میں کچھ نئے مواد کا اضافہ ہو سکتا ہے محفل کا یہ غالب نمبر انگریزی جاننے والوں کے لئے غالب کا بہت اچھا تعارف ہے۔ اسے جامع تو نہیں کہا جا سکتا مگر اس میں اتنا اچھا مواد موجود ہے کہ اس سے انگریزی جاننے والے برابر فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ چودھری نعیم، اعجاز احمد اور ان کے ساتھی لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے غالب کا خاصا چرچا امریکہ کے ادبی حلقوں میں کر دیا، ایڈرین ریچ کا یہ شعر

(باقی صفحہ پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپوایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

REGD.No-L. 322 فون نمبر ۲۹ R.No.2156/57